ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

کاشف الحقائق: تاریخی تناظر اور صیغہ مذکر کی بحث

In the Indo-Pak Subcontinent, the second half of 19th centaury was an era of revolutionary changes as long as its educational, civilizational, and literary history was concerned. In this era the best books of Urdu criticism Aab-e-Hayat, Muqadimah Sher-o-Shairi, Kaashif al Haqaiq and Sher ul Ajam were written. In this paper, Imdad Imam Asar's Kaashif al Haqaiq has been studied in the context of books that were brought out before this. The researcher argues that Kaashif al Haqaiq received influences from Aab-e-Hayat and Muqadimah Sher-o-Shairi, and in some ways its author's point of view is also different from those of Azad's and Hali's.

The second part of this paper deals with an important issue of classical Urdu poetics, i.e., masculine gender marking for the beloved in verse, as it emerges out of Kaashif al Haqaiq. The researcher shows that masculine gender marking has been justified in Kaashif al Haqaiq in two ways: 1) through linguistic structure and 2) in the backdrop of the civilizational values. This research shows that the debate on the use of masculine gender marking has been carried out in a detailed manner in Kaashif al Haqaiq.

برصغیر میں جدیدیت سرسید تحریک کے توسط سے داخل ہوئی زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر ہوا۔ اس کے بڑے ذرائع تعلیم اور ادبی تحریکیں تھیں۔ ۱۸۶۵ء میں لاہور میں چند سرکردہ نوآبادیاتی انگریز حکام کے تعاون سے جو ایک تنظیم (''انجمن پنجاب'') قائم ہوئی اس کا مقصد بظاہر قدیم مشرقی علوم کا احیا، دیسی زبانوں کے ذریعے تعلیم کا فروغ، ادبی سائنسی اور عام مسائل پر غور وفکر، حکومت کے اقدامات کو مقبول بنانا، اصحابِ علم و رسوخ اور سرکاری افسران کا مابین تعلقات کو بہتر کرنا تھا مگر سرسید احمد خان کے علی گڑھ کالج کی طرح اس کا اہم ترین حاصل ''نئے تہذیبی و ادبی'' خیالات و نظریات کا ہندوستان میں تعارف تھا جس کا ذریعہ محمد حسین آزاد کی معرکتہ الآراء کتاب آب حیات بنی۔

عام طور پر جدید اردو تنقید کا آغاز الطاف حسین حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے مانا جاتا ہے لیکن

حقیقت یہ ہے کہ جدید اردو تنقید کا نقش اول محمد حسین آزد کی معروف ترین کتاب آب حیات ہے۔ اسی کے اثرات الطاف حسین حالی پر پڑے اور حالی ہی سے بعض اثرات شبلی نے قبول کیے۔ مابعد کی اردو تنقید کا بڑا حصہ کسی نہ کسی نہ انداز سے مقدمہ شعر و شاعری سے اثر پزیر ہوتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ اردو تنقید کی دو اہم ترین کتابیں کاشف الحقائق اور ہماری شاعری بھی حالی کے اثرات سے محفوظ نہیں رہیں۔ آئیندہ صفحات میں ہم پہلے آزاد، حالی اور شبلی کے بارے میں چند امور؛ پھر حالی کے ''نیچرل شاعری'' کے کچھ بنیادی تصورات، ازاں بعد ''نیچرل شاعری'' اور شاعری کے بارے میں حالی کے اخلاقی تصورات سے کاشف الحقائق کے متاثر ہونے اور اس کی کچھ ایسی انفرادی خصوصیات کا بیان کریں گے، جو اسے آب حیات اور مقدمہ شعر و شاعری سے ممتاز کرتی ہیں۔

۱۸۸۰ء میں محمد حسین آزد کی معروف ترین کتاب آب حیات کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا، جو اردو ادب کی پہلی جدید طرز کی تاریخ ہے۔ یہ کتاب جدید ادبی تحقیق و تنقید کا نقش اول ہے اور آزاد کا ایسا کارنامہ ہے کہ اس کے بعد لکھی جانے والی ادبی تحقیق و تنقید کی اکثر کتب اس سے فیض یاب ہوتی رہی ہیں۔ آب حیات میں آزاد کا عمومی نظریہ یہ ہے کہ شاعری گرد و پیش کی دنیا سے اپنے تعلق کے اعتبار سے نمو پذیر ہوتی ہے، ترقی کرتی ہے اور پھر عروج پاتی ہے یا مرجھا جاتی ہے۔ قدما جو سوجھ بوجھ میں سادہ، حقیقی زندگی کے قریب اور پیچیدہ خیالی سے دور ہوتے ہیں ایسی شاعری تخلیق کرتے ہیں جو دلوں کو کھینچ لیتی ہے اور متاخرین، تا وقتیکہ وہ نئے طریقے اختیار کر کے ادل بدل نہ کریں، حسن و عشق کے مضامین میں اگلوں کے چبائے ہوئے نوالے چباتے ہیں۔ زوال پذیر قومیں زوال آمادہ شاعری پیدا کرتی ہیں۔ جو شاعری جتنی زیادہ آرائش و زیبائش کی حامل ہوتی ہے اور خیالی رنگوں کے طوطے مینا اڑاتی ہے وہ اتنی ہی غیر حقیقی اور مصنوعی ہوتی ہے۔ ایسی شاعری کی قسمت میں مرجھا جانا ہوتا ہے۔ اردو شاعری کو اگر اس انجام سے بچنا ہے تو اسے انگریزی کے نقش قدم پہ چلنا ہوگا۔

آب حیات کا پہلا اڈیشن ۱۸۸۰ء میں آیا تھا اور ۱۸۸۱ء میں حالی نے اس پر ایک خیر مقدمی ریویو لکھا تھا، جس سے اندازہ ہوتا ہے حالی اس سے شدید متاثر ہوئے تھے۔ اس سے بھی پہلے ۱۸۷۹ء میں لاہور کی ادبی تحریک اور اس سے زیادہ سرسید کی اصلاحی کاوشوں کے زیر اثر وہ مسدس مدوجزر اسلام لکھ کر نہ صرف مذہبی و معاشرتی بلکہ شاعری کی اصلاح کا بیڑا بھی اٹھا چکے تھے؛ مگر اس کام کو منظم طور پر کرنے کی تحریک انہیں یقیناً آب حیات سے ہوئی تھی۔ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بارے میں بنیادی بات یہ ہے کہ اس میں حالی، وقت کے ساتھ شاعری کو تبدیل کرنا اور اسے معاشرے کی اصلاح کا کام لینا چاہتے ہیں۔ وہ آزاد کی اس رائے سے پوری طرح متفق ہیں کہ شاعری کا آغاز سادگی سے ہوتا ہے، پھر اس میں مصنوعی پن آتا ہے اور آخر میں یہ زوال پذیر یا مردہ ہو جاتی

ہے۔زوال سے بچنے کے لئے معاشرے کے ساتھ اس کا تبدیل ہونا ضروری ہے۔وہ اس طرح ممکن ہے کہ یہ معاشرے کے لئے'' مفید'' بنتی رہے۔حالی مضمون سے مضمون نکالنے کے عمل کو جو سبک ہندی کا ایک خاص انداز ہے، چبائے ہوئے نوالے چبانے اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں چوسنے سے تعبیر کرتے ہیں۔وہ مجموعی پوری طرح آزاد کے اس خیال کے ہمنوا ہیں کہ'' زبان جب تک عالم طفولیت میں رہتی ہے،تبھی تک شیروشربت کے پیالے لنڈھاتی ہے، پھر سادگی اور شیریں ادائی خاک میں مل جاتی ہے۔

حالی شاعری کے آغاز ،عروج اور زوال کے بارے میں آزاد کے خیالات سے پوری طرح ہمنوا ہیں ۔فرق صرف اس امر میں ہے کہ آزاد نے جہاں صرف ڈیڑھ سو سال کے عرصے پر محیط پانچ ادوار کو اپنا موضوع بنا کر اردو شاعری کے آغاز و انجام ،ترقی و انحطاط کا تاریخی سفر بیان کیا ہے، وہاں حالی نے مسلمانوں کی شاعری کے عروج وزوال کے زمانی سفر کا آغاز عربی شاعری سے کیا ہے۔اوراپنی بات کا آغاز شاعری کی بالذات قدر کے بجائے اسکی معاشرتی جواز جوئی سے کرتے ہیں: وہ کہتے ہیں کہ'' صدر اسلام کی شاعری میں ...تمام سچے جوش اور ولولے موجود تھے... پارسا بیویاں شوہروں کے اور شوہر بیویوں کے فراق میں دردانگیز شعر انشا کرتے تھے۔ چراگاہوں، چشموں اور وادیوں کی، گذشتہ صحبتوں اور جھمگٹوں کی ہو بہو تصویر کھینچتے تھے۔'' اس لئے عربوں کی شاعری میں بے انتہا جوش پایا جاتا تھا کیونکہ اس کا'' مدار واقعات اور دل کے سچے حالات و واردات پر تھا۔''

لیکن رفتہ رفتہ نیچرل جذبات کا خاتمہ ہوگیا۔اب شعرا کے پاس صرف دو میدان رہ گئے تھے: مدحیہ مضامین ، اور عشقیہ مضامین جن سے جذبات کو اشتعالک ہوتی تھی۔ پھر ایک مدت کے بعد ان دونوں مضامین میں بھی جب ''چچوڑی ہوئی ہڈیوں'' کی طرح کچھ مزہ باقی نہ رہ گیا تو تشبیہ و استعارے اور جھوٹ و مبالغہ پر تکیہ ہوگیا۔قدما کا وہ طریقہ کہ جو بات دل میں ہو اسے سچے جوش کے ساتھ مگر ساختگی اور تصنع کے بغیر بیان کیا جائے بعد کے زمانے میں کم ہونا شروع ہوگیا۔شاعری خود شاعر کے جذبات کا عکس بننے کی بجائے قدما کی طرز و روش اور خیالات کا آئینہ بن گئی ۔جب سے ہماری شاعری میں جھوٹ اور مبالغہ داخل ہوا اسی وقت سے اس کا تنزل شروع ہوا ہے۔شاعری کے آغاز و انجام کے بارے میں سابقہ سطور میں آمدہ آزاد کے بیانات پیش نظر رہیں تو نظر آتا ہے کہ حالی کے نزدیک بھی شاعری کا آغاز سادگی سے ہوتا ہے اور تصنع و بناوٹ پر ختم ہوتا ہے۔

اردو شاعری کی ترقی کا منصوبہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ جن ذریعوں سے ایشاء کی شاعری ترقی پاتی تھی'' وہ اردو کی شاعری کے لئے فی زمانہ مفقود ہیں'' اور آئندہ ان کے مہیا ہونے کا امکان بھی نہیں، لہٰذا'' اردو شاعری کی ترقی

کا خیال پکانا گویا زمانہ ناسازگار سے مقابلہ کرنا ہے''۔اسی لئے ترقی واصلاح کے منصوبے پیش کرنے کے باوجود انہیں شاعری کے نیم مردہ جسم میں جان پڑ جانے کا کوئی یقین نہیں۔ بس 'مذبوح اور مدقوق کے دم واپسیں' کی امید کا معاملہ ہے: وہ کہتے ہیں کہ ''جو کچھ ہم لکھنا چاہتے ہیں اس سے یہ جتانا مقصود نہیں ہے کہ کچھ ہوگا بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ کاش ایسا ہوتا!''۔

شاعری وتنقید کے بارے میں شبلی کے خیالات موازنہ انیس و دبیر ،۱۹۰۶ اورسب سے بڑھ کر شعر العجم میں ملتے ہیں۔ (فارسی شاعری کی تمدنی تاریخ پر مشتمل یہ پانچ جلدیں ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۸ء کے دوران بتدریج شائع ہوئیں) شبلی نے اگر ایک طرف آزاد اور حالی کے تنقیدی تصورات سے اثرات قبول کئے ہیں تو دوسری طرف اپنے پیش رووں کے مقابلے میں بدرجہ ہا بلند علمی مقام اور ذوقی و وقوفی قوت کے بل پر بعض خاص طرح کے مسائل و معاملات کو اُنہی کی طرح اردو تنقید میں ایک حاکمانہ استواری کے ساتھ معیاری وقوائدی حیثیت بھی دے دی ہے ۔ آب حیات (۱۸۸۰ء) نے جو معیارات اور طریقہ ہائے کار متعین کئے اس کا اثر مقدمہ شعر و شاعری اور ان دونوں کے اثرات شعر العجم پر نظر آتے ہیں ۔ شعر العجم کی اشاعت کا آغاز ۱۹۰۸ء میں ہوا،لیکن شبلی کے ذہن میں اس کا منصوبہ بہت پہلے سے تھا۔اس کا کچھ حال انہوں نے جلد اول کے دیباچے میں ہی لکھا ہے۔مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے نام ۱۸۹۹ء کے ایک خط کے مطابق شبلی فارسی شاعری کی تاریخ اور عہد بہ عہد خصوصیتوں اور ترقیوں کا بیان لکھنا چاہتے تھے۔

آزاد اور حالی کی طرح شعر العجم میں شبلی نعمانی کا بھی یہی خیال ہے کہ معاشرت وتمدن میں سادگی سے پیچیدگی کے سفر کا اثر شعر پر بھی پڑتا ہے۔پھر مبالغوں،تشبیہوں اور استعاروں میں در آنے والی باریکیوں،نزاکتوں، رنگینیوں، خیال آفرینیوں،طلسم کاریوں اور جملہ مجموعہ ہائے خرابی کی ایک لمبی فرد جرم ہے جو''سادگی سے پیچیدگی'' کے فلسفے کے تحت شعرائے متاخرین کے سر لگائی گئی ہے۔کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سب بواسطہ مقدمہ شعروشاعری ، آب حیات سے نہیں آرہا! شاعری کے عروج وزوال کو شبلی بھی تمدنی وسیاسی حالات کے تابع دیکھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اردو میں بھی یہی حالت تھی۔شبلی کے شعری تصورات ... تخیل کی ماہیت ، اس کی بے راہ روی ،واقعیت و اصلیت ، مبالغہ، مطالعہ فطرت ،تشبیہ واستعارہ کی پیچیدگی، شاعری کے عروج و زوال یا تدریجی ارتقاء میں سادگی سے آغاز اور پیچیدگی پر اختتام، تجریدی وخیالی مضمون آفرینی ....اور شاعری کے اخلاقی وسماجی کردار کے بارے ان کے خیالات پوری طرح اپنے نامور پیش رووں سے اثر پزیر ہیں، یا نرم الفاظ میں یوں کہیے کہ اس معاملے میں ان سب

کے مآخذ ایک ہیں۔

اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا کہ آزاد، حالی اور شبلی اپنے دور کے غالب انگریزی اثرات سے شدید طور پر متاثر ہوئے تھے۔ یہ بزرگ جو اثرات قبول کر رہے تھے ان کے بارے میں ان کی ذاتی معلومات سنی سنائی باتوں سے زیادہ نہ تھی۔ آزاد کے نزدیک فارسی کی خیالی رنگینیوں اور فرضی لطافتوں کے زیر اثر اردو بدیہی و محسوس باتوں کے بیان میں بھی تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ در پیچ خیالوں میں آ کر عالم تصور میں جا پڑی اور بھاشا کی سادگی سے محروم ہو گئی تھی۔ اور اردو اردو کی پیچ داری انگریزی کے تتبع سے دور ہو سکتی تھی۔ کیونکہ واقعیت اور سادگی کے یہ خزانے انگریزی صندوقوں میں بند اور ان کی چابیاں انگریزی دانوں کے پاس تھیں۔ چونکہ انگریزی نیچرل خیالات اور محسوسات کے بیان میں کمال رکھتی تھی اسی لئے آزاد نے نیرنگ خیال میں اپنی ''ذاتی امنگ اور شوق'' سے جانسن اور ایڈیسن کے نیچرل مضامین لکھے تھے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ یہ ''ذاتی امنگ اور شوق'' اس وقت پیدا ہوے جب ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے مشاعروں کے آغاز پر کرنل ہالرائیڈ کی تقریر میں ''نظم اردو جو چند عوارض کے باعث تنزل اور بدحالی میں پڑی'' ہوئی تھی، کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے جانے کے لیے جملہ رؤسا اور اہل علم لوگوں سے درخواست کی گئی تھی۔

آج پس استعماری مطالعات کے عہد میں استعماری آقاؤں کے رعب و دبدبے اور ذہنوں کو مسخر کرنے کے ان کے طریقہ ہائے واردات کی روشنی میں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ انگریز آقا (اور وہ بھی ۱۸۷۵ء کا فاتح انگریز، جس کی فتوحات کے اثر سے ہم آج بھی نہیں نکل سکے) کی درخواست میں التجا کتنی ہوتی ہے اور حکم کتنا، اور پبلک انسٹرکشن ڈیپارٹمنٹ کے ایک ملازم کے لئے جو اپنے ذہن پر سوار ماضی کے کابوس سے ہر قیمت پر چھٹکارہ چاہتا تھا، آقا کی درخواست/حکم سے سرتابی کس حد تک ممکن تھی، اہم بات یہ ہے کہ آزاد کرنل ہالرائیڈ کے زیر اثر آنے کے بعد پہلے والے آزاد نہ رہے تھے۔ یہی کچھ حالی کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے جنکی ''نیچرل شاعری'' کے کی ایک ''ھُو'' نے اردو تنقید کے بڑے بڑے اماموں کو بڑے عرصے تک دیوانہ بنائے رکھا تھا۔

آزاد اور حالی کی ''نیچرل شاعری'' کا یہ تصور، اگر یہ کوئی تنقیدی تصور ہے تو، ہمیں کلاسیکی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔ کیونکہ وہاں نہ صرف یہ کہ ''فطری شاعری'' کی کوئی اصطلاح نہیں بلکہ اس مفہوم کے قریب ترین کوئی تصور بھی نہیں اور نہ وہاں نیچرل شاعری کے عناصر سہ گانہ-- سادگی، اصلیت اور جوش-- کے مصداق کوئی تصور تھا۔ یہ ''نیچرل ازم'' اس زمانے کا فیشن تھا اور انگریزی رومانویت کا حصہ؛ مگر جلد ہی یہ تصورات مغرب میں بھی قصہ

پارینہ بن گئے ۔ رومانویت کا ردعمل رئیل ازم کی صورت میں ہوا اور رئیل ازم کی بھی اتنی مختلف صورتیں بنیں کہ پہچانی نہیں جاتی۔ فرانسس پریچٹ کا کہنا ہے کہ یورپ میں آج یہ بات کہ نیچرل شاعری نامی کوئی شے ہوتی ہے، اتنا اجنبی ہو چکا ہے کہ اکثر نقادوں کے لئے اسے سمجھنا بھی ممکن نہیں رہا۔ مگر اردو تنقید میں شاعری کے نیچرل اور حقیقت پسندانہ ہونے کا تصور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر بہت بعد تک چلتا نظر آتا ہے۔ یہاں آج بھی شاعری کے جذبات کے اظہار والا تصور بڑا مقبول ہے۔ ایم ایچ ابریمس کا کہنا ہے کہ مغرب کے ادبی وتنقیدی نظریات میں شاعری کے بارے میں شخصیت یا جذبے کے اظہار والا تصور ورڈز ورتھ یا بالفاظ دیگر رومانویوں کی دین ہے ۔ ہمارے ہاں آج بھی ایسے نقادوں کی کمی نہیں جو اردو غزل کے ان نیچرل ہونے اور اس میں سچے ،فطری، بے ساختہ اور حقیقی جذبات کی کمی کا رونا روتے ہیں اور آزاد اور حالی کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں چچوڑتے نہیں تھکتے ۔[۱]

یہ ہے وہ پس منظر جس میں امداد امام اثر نے اپنی معروف کتاب کاشف الحقائق لکھی۔ اس میں میں مغربی معیارات شعر کی تدریجی ترویج کے مقابلے میں مشرقی معیار نقد قائم کرنے کی اگرچہ شعوری کوشش پائی جاتی ہے مگر یہ اس دور کے غالب اثرات سے محفوظ بھی نہیں۔ کاشف الحقائق کا واضح مقصد اگرچہ حالی کا جواب دینا نہیں تھا مگر امداد امام اثر کے ہاں فطری وغیر فطری شاعری کے فرق ،مضمون کے نیچرل ہونے کے باوجود مکروہ ہونے ،فطرت کا تتبع وشاعری بطور نقل، سادگی واصلیت ،شوکت الفاظ ، رعایت لفظی ، اور مبالغہ پردازی جیسے مسائل اس امر کا ثبوت ہیں کہ مصنف کے مدنظر مقدمہ حالی کے اٹھائے ہوئے سوالات کے پس منظر میں اردو و فارسی کے بارے میں اپنا محاکمہ پیش کرنا تھا جس میں وہ اکثر حالی کا اتباع اور کہیں کہیں ان سے انحراف کرتے ہیں۔

حالی اور شبلی کی طرح امداد امام اثر بھی شاعری کے بارے میں اخلاقی نقطہ نظر کے حامل ہیں اور موسیقی ومصوری کی طرح شاعری کو رضائے الٰہی کی نقل اور مصلح اخلاق قرار دیتے ہیں، جو معاملاتِ خارجیہ و امورِ ذہنیہ میں تبعیت ِ فطرت کے ذریعے معاملاتِ رزم کو آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتی اور کیفیت عشق کی تصویر بھی دکھا دیتی ہے۔ وہ شاعری کو بہترین ذریعہ اخلاق آموزی بھی کہتے ہیں اور اس کے اثر وتاثیر سے تمدنی و اخلاقی امور بڑے بڑے کام لئے جا سکنے کی مثالیں بھی دیتے ہیں۔ اس اخلاقی وسماجی وظیفے کے تحت ہی وہ شاعری کا مدار 'خوش خیالی' پر قرار دیتے ہیں نہ کہ 'شوکت لفظی' پر۔ یہاں خوش خیالی سے مراد عمدہ و پاکیزہ خیالات ہیں جو ظاہر ہے کہ شاعری کی جمالیاتی صفت نہیں بلکہ اخلاقی صفت ہے ۔ اسی طرح رعایت لفظی ، مبالغہ پردازی ، صنائع بدائع ، اور پست خیالی کے زیر عنوان کاشف الحقائق میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ کاملاً حالی کے خیالات ہی کا عکس ہے۔ فطرت کی تبعیت کو آثر بہت

ضروری خیال کرتے ہیں مگر حالی کے برعکس نیچرل طور پر بندھے ہوئے ہر قسم کے مضامین کو لازماً اچھی شاعری نہیں سمجھتے۔اس میں شک نہیں کہ امداد امام اثر ایشیائی شاعری کو مجموعہ معائب قرار دے کر ساری خوبیاں یورپ ہی پر ختم نہیں سمجھتے، آنکھ بند کر کے یورپین شاعری کے تتبع کا مشورہ بھی نہیں دیتے اور نہ ان کے ہاں اردو و فارسی کے مختلف اصناف سخن کے بارے میں اپنے پیش روؤں کا سا تحقیری رویہ پایا جاتا ہے؛ بلکہ غزل کا دفاع کرتے ہوئے تو ایک مقام پر انہوں نے بنا نام لئے صاف سرسید اور حالی کو ان کی انگریز پرستی کی بناء پر سخت سست بھی کہا ہے:

> اس زمانہ میں تقاضائے سلطنت سے انگریزیت نے ایسی تاثیر پھیلائی ہے کہ ہر شے جو ملکی وضع ترکیب ساخت روش وغیرہ کی ہے تنگ چشموں کی آنکھوں میں ذلیل اور خوار نظر آتی ہے۔جن حضرات نے علوم یورپ حاصل کیے ہیں ان کا انقلاب مذاق خیر اتنا حیرت انگیز نہیں ہے مگر تعجب ان حضرات سے ہے جو نہ انگریزی جانتے ہیں نہ فرانسیسی مگر صحت و عدم صحت مذاق پر بحث کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں اور ہندوستانی علوم و فنون کی مذمت بے دھڑک کرنے لگتے ہیں۔ ایسے حضرات کے نزدیک ہر شے جو ہندوستان سے تعلق رکھتی ہے بفتوائے یقین مقدوح و مذموم ہے۔منجملہ دیگر اشیائے ملکی کے ملکی شاعری بھی ان کے خیال میں پر از عیوب متصور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ملکی شاعری میں معائب ہیں۔مگر یورپین شاعری بھی عیوب سے پاک نہیں ہے۔ یورپین شاعری کے عیوب ایسے حضرات کو سوجھائی نہیں دیتے اور حقیقت یہ ہے کہ انہیں یورپین شاعری کے عیوب کیوں کر نظر آئیں جب ان کی اطلاع کوٹ، پتلون، کرسی، میز، چھری کاٹنے وغیرہ کے اندر محدود ہے۔ ایسے حضرات کو ہومر، درجل، ہارس، ڈینٹی، شکسپیئر، ملٹن، شیلی بیرن، ٹینسن وغیرہ ہم کے حسن و قبح سے کیا خبر ہے جو یورپین شاعری کا دم بھرتے ہیں اور شاعری ایسے امر اہم میں رائے زنی کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں۔ ایسے حضرات غزل سرائی کے مادے میں جو جو صورتیں اصلاح کی بتاتے ہیں اس کی نسبت یہی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے غزل سرائی کی خوبیوں کو عجز طبیعت کے باعث درک نہیں کیا ہے یا ان پر انگریزی کا جہل مرکب ایسا سوار ہو رہا ہے کہ جب تک دن (کذا، ان؟) کے خیال کے مطابق انگریزی مذاق کے ساتھ غزل سرائی نہیں کی جائے تب تک غزل سرائی مطبوع رنگ پیدا نہیں کر سکتی۔ان حضرات سے بعض فرماتے ہیں کہ غزل میں ہمیشہ عشقیہ مضامین باندھے جاتے ہیں۔ جو مخرب تہذیب ہوا کرتے ہیں۔ لازم ہے کہ ایسے مضامین کے عوض وعظ ، پند، نصیحت، اخلاق تمدن اور نیچرل سینریاں (کذا، سینریوں؟) کی باتیں موزوں کی جائیں۔ نیچرل سینریاں عبارت ہیں جبال، بحور، صحرا، میدان کشت راز، حیوانات، نباتات، ہوا، برق

باران وغیرہ وغیرہ کی نمود سے۔ ایسے معترضین کی خدمت میں عرض راقم یہ ہے کہ غزل وہ صنف شاعری ہے کہ جو مضامین عشقیہ کے لیے موضوع کی گئی ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس میں اعلا درجہ کے واردات قلبیہ معاملات روحیہ اور امور ذہنیہ حوالہ قلم کیے جائیں۔ اگر واقعی کسی غزل سرا (کو) ایسے مضامین کی بندش کی قدرت ہے تو اس کی غزل سرائی مخرب تہذیب ہونہیں سکتی۔ بلکہ اسکی غزل سرائی سے بہت کچھ اصلاح قلب وروح کی امید کی جاسکتی ہے۔[۲]

شمیم احمد اس اقتباس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہ خیالات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسا آج لکھے گئے ہوں اور اس متوازن زاویہ نظر کو پیش نظر رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہتر سال پہلے اس مذاق سخن کا بیج اگر سرسید کی تحریک اور حالی کی مقبولیت نہ مار کر رکھ دیتی تو آج ہماری فکر صحیح میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ممکن ہوتا۔[۳]

ان امور پر ڈاکٹر تحسین فراقی کا یہ کہنا غلط نہیں کہ کاشف الحقائق ''بہت حد تک اس متوازن زاویہ نگاہ کی نشاندہی کرتی ہے جو حالی کے یہاں کسی قدر یک رخا اور جانب دارانہ صورت اختیار کر گیا تھا''[۴]

صنف غزل کی انفرادیت تعین کرنے کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی نے اثر کو یوں داد دی ہے:

آخر میں ایک بات اثر صاحب ایسی کہہ گئے ہیں جس پر درجنوں تنقیدی مضمون نثار کئے جاسکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہر صنف کے قوانین الگ ہیں، رسومیات الگ ہیں۔ غزل کے شاعر کو دریا، پہاڑ، مناظر قدرت وغیرہ کے بیان سے کچھ سروکار نہیں کیونکہ غزل کے قواعد الگ ہیں، تقاضے الگ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اصناف کی انفرادیت اور ان کی صفات وحدود کا تقاضا امداد امام اثر کو حالی اور شبلی سے زیادہ تھا۔ ہم ان کی باتوں سے اتفاق کریں یا نہ کریں، لیکن ان کے اس کارنامے کا جتنا اعتراف کریں کم ہے۔[۵]

امداد امام اثر کے ہاں نظری تنقید کے مباحث بہت کم پائے جاتے ہیں اور عملی تنقید کے ذیل میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے ایک مداح (اور مرتب کاشف الحقائق) وہاب اشرفی کے نزدیک بھی زیادہ اہم نہیں ہے۔ لیکن نظری تنقید کی جو کچھ بحثیں موجود ہیں ان میں بقول ابوالکلام قاسمی سرسید، حالی اور شبلی کے ادبی تصورات کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ اور کذب ومبالغہ، صنائع بدائع، اور تصنع وتبعیتِ فطرت کے باب میں ان کے خیالات پر جدید یورپی اثرات کا بڑا واضح اثر ہے۔ مثلاً رعایتِ لفظی، شوکتِ الفاظ، مبالغہ آرائی، اخلاقی نقطۂ نظر،

شاعری بطور نقل، فطری اور غیر فطری شاعری، ہوا و ہوس، خیال کی پستی، تشبیہ، استعارے، مبالغہ پھبتی، صنع جگت اور دیگر صنائع بدائع سے متعلق ان کے خیالات کم و بیش وہی ہیں جن سے آزاد اور حالی بھی نفور ہیں یا جن کے وہ مؤید ہیں۔ ان سب کی تفصیل کے لیے ڈاکٹر امتیاز احمد کا مضمون ''کاشف الحقائق کی تاریخی وتنقیدی اہمیت'' بھی ملاحظہ کرنا چاہیے۔[۶]

جیسا کہ مذکور ہوا محمد حسین آزاد کی آبِ حیات 1880 میں چھپی تھی۔ حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کا سنِ اشاعت 1894 ہے اور شبلی کی موازنہ انیس و دبیر [۷] 1906 اور شعرالعجم کی جلدیں 1908 سے 1918 کے دوران شائع ہوئی ہیں جبکہ امداد امام اثر کی کاشف الحقائق کا سالِ اشاعت 1897 متعین کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو کاشف الحقائق جدید اُردو تنقید کا تیسرا بڑا سنگِ میل ہے اور یہ شبلی کی مذکورہ بالا کُتب سے پہلے کی تصنیف ہے۔ 1880 تا 1908 کا اٹھائیس سالہ عرصہ اُردو تنقید کی تاریخ میں اس اعتبار سے یاد رکھا جائے گا کہ اس عرصے میں تنقید کی چار اہم کتب منصۂ شہود پر آئی ہیں۔ کلاسیکی اُردو شاعری کو نئے انگریزی خیالات کی روشنی میں دیکھنے کا جو سلسلہ آبِ حیات سے شروع ہوا اس کے راست اثرات حالی پر پڑے اور پھر امداد امام اثر اور شبلی بھی ان اثرات سے بچ نہ پائے تھے۔ جدید اُردو تنقید کے بنیاد گزار اگرچہ آزاد اور حالی ہی ہیں مگر بعض اعتبارات سے امداد امام اثر کا ذہنی افق اور ادبی مطالعہ براہ راست یا بالواسطہ اپنے ان دونوں پیش روؤں کی نسبت زیادہ وسیع تھا۔ اپنے کلاسیکی سرمائے کے نقص پر حرف رکھنے والے انگریزی لالٹینوں کی روشنی میں چندھیائے ہوئے نئے تعلیم یافتہ دماغوں کے بے بصری کی طرف اشارہ تو آزاد بھی کرتے ہیں لیکن وہ خود یہ بھی کہتے تھے کہ واقعیت اور سادگی کے خزانے انگریزی صندوقوں میں بند ہیں اور ان کی چابیاں انگریزی دانوں کے پاس ہیں۔[۸] لیکن امداد امام اثر ایشیائی شاعری کو مجموعہ معائب نہیں سمجھتے اور ایسا سمجھنے والوں کی خبر بھی لیتے ہیں:

> مگر اس زمانے میں ایک نئی بیماری پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اکثر ادھورے انگریزی خوانوں کے دماغ میں اس خیال فاسد نے جگہ کر لی ہے کہ ساری خوبیاں یورپ پر ختم ہوگئی ہیں۔ ایشا کو خوبی کا کوئی حصہ ملا نہیں ہے۔۔۔ قصور معاف اکثر ہمارے نئی روشنی والے حضرات کا تو ایسا ہی خیال معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایشائی خیالات، اوضاع و معاملات کو یک قلم قابل نفرت سمجھتے ہیں۔ یورپ کے ہر امر پر عام اس سے کہ معقول ہو یا غیر معقول جان دیئے دیتے ہیں اور اپنے اقوال و افعال سے عجب طرح کی نادیدگی ظاہر کرتے ہیں۔ جا و بیجا ہر قدم پر اہل یورپ کے تتبع پر مستعد رہتے ہیں معلوم ہوتا ہے۔ خذما صفا و دع ما کدر کا مضمون ان کے گوش مبارک تک کبھی پہنچا ہی نہیں۔

ان حضرات کی دلدادگیاں معاملات یورپ کی نسبت اس درجہ کو پہنچ گئی ہیں کہ ایشائی شاعری بھی ان کی نظر میں ذلیل ومحقر معلوم ہوتی ہے۔۔۔نئی روشنی والے حضرات نے اس کو تسلیم کر لیا ہے کہ جو معائب ہیں ایشائی شاعری میں ہیں اور یورپین شاعری تمام معائب سے مبرا ہیں۔ میں آئندہ انشااللہ اللہ تعالیٰ یوردپین شاعری کی معائب بھی دکھلاؤں گا۔جس سے معلوم ہو جائے گا کہ یورپین شاعری ایسی نہیں ہے کہ آنکھ بند کر کے شعرا یورپ کا تتبع کیا کریں اس میں شک نہیں کہ فارسی اور اردو کی شاعریاں معائب رکھتی ہیں۔مگر ان معائب سے ایشائی شاعریاں ایسی ذلیل نہیں ہیں کہ کسی حکیم یا مرد تحصیل کے قابل توجہ نہ ہوں۔راقم جب ان نئی روشنی والوں کو یورپ کی شاعری کا ذکر کرتے سنتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں یورپین شاعری تمام معائب سے پاک متصور ہے۔ اور ایشیائی شاعری اس کے برخلاف سراسر عیب ہی عیب ہے۔ بدانست راقم اس تنگ چشمی کا سبب نادیدگی ہے یا یہ کہ یورپین شاعری کی بسبب ایک امر جدید ہونے کے پُر لذت معلوم ہوتی ہے۔اس میں شک نہیں کہ یورپین شاعری کی آگاہی سے ہم ایشائیوں کی شاعری سے بہت کچھ فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔اس سے نئے مضمون دستیاب ہو سکتے ہیں۔مگر یہ فائدہ یورپین شاعری کو بھی ہماری ایشائی شاعری سے پہنچ سکتا ہے۔ اس واسطے کہ بہت نازک خیالیاں ایشائی شاعری میں ایسی ہیں کہ جن سے شعرائے یورپ کے دماغ کو بھی آشنائی پیدا نہیں ہوتی ہے۔اس امر سے اعتراف خود اہل یورپ اور اہل امریکہ کو ہے۔[۹]

آزاد اور حالی کے ہاں یورپی محققین کے خیالات کے اثرات بہت واضح تو ہیں مگر براہِ راست نہیں۔ان دونوں کے بارے میں معلوم ہے یہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔انگریزی زبان و ادب کے بارے میں ان کی آراء بچشمِ خود پڑھی کتابوں کی نسبت سنی سنائی باتوں پر زیادہ تھی مگر یہ ان کی خداداد ذہانت، طباعی اور خلاقی کا کمال تھا کہ ان آراء کی بنیاد پر یہ لوگ اُردو زبان میں کچھ ایسے تصورات رائج کر گئے کہ ایک لمبے عرصے تک بعد کے نقادوں کا ان سے بچ کر چلنا مشکل ہوگیا تھا۔ان کے برعکس امداد امام اثر کے بارے میں دستیاب مواد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی زبان، اس کے ادب اور انگریزی میں دستیاب قدیم مصری، یونانی، رومی اور لاطینی زبانوں کے ادب سے آزاد اور حالی کی نسبت زیادہ آگاہ تھے۔اسی لیے کاشف الحقائق کا ابتدائی حصہ عربی فارسی کے قدیم ادب کے بجائے دنیا کی دیگر قدیم زبانوں سے بحث کرتا ہے، جو کہ آزاد اور حالی کی کتب کی عمومی اسکیم پر ایک ایسا اضافہ ہے جس کی اُس زمانے میں کم ہی مثالیں تھیں۔آج جبکہ انگریزی سے راست واقفیت پہلے سے کہیں بڑھ کر ہے، اپنی کچھ کوتاہیوں کے باوجود مذکورہ زبانوں کے ادب کے بارے میں امداد امام اثر کی کئی آراء اور ان زبانوں کی اصناف سے اُردو و فارسی

اصنافِ ادب کا موازنہ آج کے اردو ناقدین کے لیے باعث حیرت بھی ہے اور اپنے اندر لطف و آگاہی کا سامان بھی رکھتا ہے۔ جیسا کہ سابقہ سطور میں اشارہ ہوا، شاعری کی ماہیت اور اس کے سماجی وظیفے کے بارے میں اثر کے تصورات چند ثانوی جزوی فرق کے ساتھ حالی کے تصورات سے اثر پذیر ہیں مگر اس کے باوجود کاشف الحقائق اپنے دور تک کی مشرق و مغرب کی ادبیات و اصناف سے متعارف کرانے کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ آج کے انتقادِ ادبیات کے طالبِ علم اس اہم کتاب کے تاریخی تناظر سے آگاہ کریں۔ آزاد اور حالی کے برعکس امداد امام اثر کی اس کتاب میں انگریزی صندوقوں میں بند خزانوں سے کوئی مرعوبیت نہیں پائی جاتی اور وہ انگریزی و دیگر یورپی اصناف سخن کے مقابلے میں اردو اصناف کے حوالے سے نہ تو خود کسی احساس کمتری کا شکار ہیں اور نہ اپنے قارئین کو مغربی ادبیات کی ایسی نقل کا مشورہ دیتے ہیں جس کے بغیر ارد و شاعری کے معرضِ ہلاکت میں پڑ جانے کا خطرہ ہو۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے بقول:

> یورپین مصنفوں کے حوالوں اور ایک طرح کی بین الاقوامی فضا کے باوجود امداد امام اثر کے یہاں کسی تاریخی دباؤ، تبدیلی، کسی انقلاب، کسی فیصلہ کن موڑ کی ضرورت کا احساس نہیں ملتا۔ کاشف الحقائق کی مجموعی فضا ایسی ہے گویا انگریز کا وجود ہندوستان میں نوآبادیاتی حاکم کی طرح نہیں، بلکہ ایک علمی وجود کے طور پر ہے۔ انگریزی تہذیب، سیاست اور اصول معاشرت نے اہل ہند کی زندگی میں جو منفی اثرات پیدا کئے تھے اور حساس اہل ہند (مثلاً سرسید اور ان کے رفقا) کو ان اثرات کے خلاف اہم اور تقریباً انقلابی اقدامات کرنے پر مجبور کیا تھا، امداد امام اثر اس سب سے بالکل بے تعلق معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو ہماری شاعری میں 'اصلاح' کی ضرورت کی بظاہر کوئی فکر نہیں۔[۱۰]

اب چند باتیں کاشف الحقائق کی زبان اور اسلوب کے بارے میں۔ ہم جانتے ہیں کہ محمد حسین آزاد اپنے ادبی نظریات کے ساتھ ساتھ، بلکہ ان سے کہیں زیادہ، اپنے اسلوبِ نثر، افسانوی اندازِ بیان اور پیکر تراش طرزِ نگارش کی وجہ سے آج بھی ناقابلِ سبقت ہیں۔ مگر مقدمہ شعر و شاعری میں الطاف حسین حالی نے جس تنقیدی اسلوبِ نثر کی بنیاد ڈالی ہے وہ آج اکیسویں صدی کے آغاز تک بھی اُردو تنقید کا سب سے معیاری نمونہ ہے۔ آج کا قاری آزاد کے اسلوب کو رشک کی نظروں سے تو دیکھتا ہے مگر تنقید لکھتے ہوئے اس اسلوب کو اختیار کرنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ حالی، آزاد کے تنقیدی تصورات سے تو اثر پذیر ہوئے مگر انہوں نے آزاد کے اسلوبِ نگارش سے خود کو دور رکھا اور سرسید کی نثر کا مقلد ہونے کی وجہ سے سادہ، ترسیلی، ابلاغی، توضیحی، علمی اور قطعیت پسند اسلوبِ تنقید کے بنیاد گذار

ہوئے۔ اس پسِ منظر میں امداد اثر کا اسلوب حالی کے صاف اور سادہ اسلوب کے برعکس عربی و فارسی الفاظ سے قدرے مملونظر آتا ہے۔ مگر یہاں عربی و فارسی کلمات وتراکیب اردو نثر میں اس طرح کھپا دیئے گئے ہیں، باوجودیکہ وہ ہماری آج کی بول چال کی زبان کا مروج انداز نہیں مگر پھر بھی بجائے اجنبیت کے ایک ذائقے دار نثر کا نمونہ بن گئے ہیں۔ اس نثر کی لفظیات اور تراکیب شاعرانہ اور رومانویت زدہ نہیں بلکہ کہیں کہیں دینی رسائل و کتب والی عربیت کی فضا کا تاثر پیدا کرتی ہیں۔ اثر چونکہ خود بھی ایک صاحبِ علم اور اخلاقی و مذہبی تہذیب کی پروردہ شخصیت تھے، اس لیے ان کا اسلوب توضیحی سادگی کے بجائے ایک علمی ثقاہت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ ان کی زبان ادیبانہ ہونے کے بجائے عالمانہ ہے۔ علمیت اگرچہ حالی اور شبلی میں بھی کم نہیں مگر ان دونوں بزرگوں کی زبان شستہ اور صاف ہونے کے ساتھ ساتھ شگفتگی میں بھی بے مثال ہے۔ حالی کے ''مقدمے'' میں تو بعض جگہوں پر مثلاً جہاں وہ بعض مبذل روایتی مضامین کی بھد اڑاتے ہیں، نہایت لطیف مزاح کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ مزاح کی یہ لہر شبلی میں کم ہے، گو اس کی کمی وہ شگفتگی اور تازہ کاری سے پوری کر لیتے ہیں، مگر امداد امام اثر کے ہاں تو یہ شے بالکل نایاب ہوگئی ہے۔ اس کے برعکس ان کے اسلوب کا واضح امتیاز ثقاہت، ثقالت اور علمی رکھ رکھاؤ ہے۔ ان کے جملوں کی ساخت اور مرکبِ اضافی وتوصیفی کی ترتیب میں حرفِ اضافت یعنی ''زیر'' کا خاص اہتمام ہے جسے درست پڑھنے کے لیے قاری کا چھوٹا موٹا عالم ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ بات میں اپنے زمانے کے بدلے ہوئے مذاقِ سخن اور کندۂ نا اتراش قارئین کی اکثریت کی بنا پر کہہ رہا ہوں ورنہ سچ پوچھیں تو ایک خاص طرح کی نثر کا جو لطف اثر کے ہاں ہے وہ انہی سے مخصوص ہے۔ حالی کا تنقیدی طریقِ کار اپنے پڑھنے والوں کو جہاں خالص اور متین نظری تنقیدی مسائل سے آگاہ کرتا ہے وہاں آزاد، شبلی اور اثر کا تنقیدی انداز، اسلوبِ نثر اور ادبی شعور پڑھنے والے کے ذوق کی تربیت کا بھی وافر سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ آج جبکہ نئے تنقیدی نظریات سماجیاتی و بشریاتی علوم کے آلۂ کار بنکر قاری کے اندر ادب کا جمالیاتی تجربہ بیدار کرنے سے لاتعلق ہو چکے ہیں امداد امام اثر کے اسلوبِ تنقید میں جدید دور کے اس مرض کا بھی شافی علاج ہے۔ یہ تسلیم کئے بنا چارہ نہیں کہ شاعری کی ماہیت اور وظیفے کے بارے میں اثر کے خیالات سے کُلی اتفاق نہ ہو تب بھی کاشف الحقائق میں ہم فنِ شاعری اور اُردو و فارسی شعرا کے انتخابِ کلام اور ان پر اثر کی نکتہ سنجیوں سے اپنی ادبی تہذیب کے ایک بہت بڑے جمالیاتی منطقے سے آگاہی پاتے ہیں۔

ان امور کی بنا پر ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری نئی نسل اُردو تنقید کے اس اہم سنگِ میل ـــــ کاشف الحقائق ـــــ کو بھی اپنے علمی شجرے کا ایک اہم حصہ جان کر اس سے اپنی واقفیت تازہ کرے اور اس میں برتے گئے منفرد اسلوب سے آگاہی پا کر اُردو نثر کے اسالیب کے رنگوں کا جائزہ لے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آج کے زمانے میں

کاشف الحقائق کے اسلوب کا چلن نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ غالب کی سی اُردو نثر کا بھی تو اب رواج نہیں ہے۔ کسی زبان کی نثری روایت میں پائے جانے والے تمام اسالیب کو زندہ رکھنے اور انہیں اپنے شعور کا حصہ بنائے رکھنے کی ضرورت ہر حال میں باقی رہتی ہے۔

ایک اور بحث جو کاشف الحقائق میں نہ صرف یہ کہ بہت ہی پُر لطف ہے بلکہ ایک خطرناک غلط فہمی کو دور کرنے والی بھی ہے وہ ہے فارسی و اُردو شاعری میں صیغہ تذکیر کا استعمال اور اس کی ادبی و تہذیبی معنویت۔ حالی نے اس مسئلے پر جو گفتگو کی ہے وہ غزل میں مضامین عشقیہ کے حوالے سے ہے، اخلاق و پاکیزگی اور معاشرتی وضع داری کے قائل ہونے کی بنا پر حالی عمومی طور پر صیغہ مذکر کے استعمال میں کوئی حرج نہیں سمجھتے:

> اس لیے ہماری یہ رائے ہے کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کئے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں اور جہاں تک ہو سکے کوئی ایسا لفظ نہ آنے پائے جس سے کھلم کھلا کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے۔۔۔ اسی طرح غزل میں ایسے الفاظ استعمال کرنے جو عورتوں کے لوازمات اور خصوصیات پر دلالت کریں اس قوم کی حالت کے بالکل نامناسب ہیں جو پردہ کے قاعدہ کی پابند ہو۔[۱۱]

لیکن یہ شے چونکہ مضامین اور اسلوب کے بمطابق فطرت و اصلیت ہونے والی اسکیم کے خلاف ہے اس لیے حالی یہ بھی کہتے ہیں کہ:

> لیکن معشوق کا کبھی چہرہ یا قبا یا سبزہ خط کے ساتھ اور کبھی چوٹی موباف آرسی اور چوڑیوں کے ساتھ ذکر کرنا اور باوجود اس کے افعال وصفات کو ہمیشہ مذکر لانا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ معشوق نہ مرد ہے اور نہ عورت بلکہ زنانہ ہے یا ہیجڑا۔[۱۲]

یہی وہ مسئلہ ہے جو آگے چل کر دیگر جدید ادبی نظریات اور خصوصاً ترقی پسند تصورات کے تحت کلاسیکی شاعری پر مزید اعتراضات کا باعث بنا اور اُردو و فارسی شاعری میں محبوب کے لیے صیغہ مذکر کے استعمال کو اُس معاشرت کی امرد پرستی پر محمول کیا گیا۔ اس نقطۂ نظر کی حمایت اور مخالفت میں بعد کے نقادوں نے بھی خوب خوب دادِ تحقیق دی ہے۔

لیکن انیسویں صدی کے اختتام پر چھپنے والی اس کتاب میں امداد امام اثر نے محبوب کے لیے صیغہ تذکیر کے استعمال کی جو توجیہہ پیش کر کے امرد پرستی والے تصور کو رد کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ محض لسانیاتی اور فنی اعتبار سے ہی معترضین کے لیے مُسکتِ جواب نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ــــ اور یہ اس مسئلہ کا اہم ترین پہلو ہے ــ تہذیبی

حوالے سے بھی مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کی باکمال کوشش ہے۔

جیسا کہ سابقہ صفحات سے واضح ہے کہ سرسید تحریک اور آزاد و حالی کے تنقیدی نظریات کا ایک اہم پہلو ''فطرت'' سے مطابقت اختیار کرنا ہے۔''نیچرل شاعری'' میں تبعیتِ فطرت پر خاصہ زور رہا ہے۔ اردو، فارسی شاعری میں صیغہ تذکیر پر اعتراضات کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے اس کے پیچھے یہی تبعیتِ فطرت کی پاسداری کا تصور کارفرما ہے۔ کلاسیکی اردو و فارسی میں محبوب کے لیے بالعموم جو مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے وہ اس بنا پر موردِ اعتراض بنتا رہا ہے کہ فطری طور پر مرد کی محبوب عورت ہوتی ہے اس لیے اس سے خطاب بھی فطری طور پر تانیثی صیغے سے ہونا چاہیے لیکن کلاسیکی شاعری میں محبوب کے لیے چونکہ بالعموم صیغہ مذکر استعمال ہوا ہے، اس لیے یہ ایک غیر فطری روایت ہے۔ اس ذیل میں اثر لکھتے ہیں:

> بلاشبہ یہ فطرتی تجربہ سخن سنجی کا ہے اور زبان عربی میں بہت بھلا بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح یورپین زبانوں میں بھی عاشقانہ خطاب کا یہی طور ہوا کرتا ہے۔ مگر فارسی اردو اور ہندی میں اس کے برعکس طریقہ برتا جاتا ہے۔ بعض نئی روشنی والے حضرات فارسی اور اردو کے اس انداز کلام پر منہ آتے ہیں اور غایت نافہمی سے اظہار رائے فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ اب متروک کیا جائے۔ اپنی اس رائے کی تائید یہ حضرات اس دلیل کے ساتھ کرتے ہیں کہ فطری طریقہ عاشقانہ سخن سنجی کا یہ ہے کہ خطاب عاشقانہ مرد کی طرف سے عورت کی جانب ہونا چاہیے مگر یہ نہیں معلوم ہوا کہ قوانین فطرت میں کیا نقصانات لاحق ہو جا سکتے ہیں اگر وہی خطاب عاشقانہ عورت کی طرف سے مرد کی جانب کیا جائے۔ اس امر کی طرف راقم عنقریب رجوع کرے گا کس واسطے کہ یہ امر ہندی گیت دوہرہ وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر فارسی اور اردو کے انداز سخن سنجی پر جو اعتراض حضرات مسبوق الذکر کا ہے اس کی نسبت یہ عرض ہے کہ فارسی میں تو نہ اسما نہ ضمائیر قید تانیث و تذکیر رکھتے ہیں پس یہ اعتراض عام طور پر کیوں کر عائد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اشعار ذیل میں معشوق کے مذکر ہونے کی کوئی تخصیص نہیں نظر آتی۔[۱۳]

اس کے بعد وہ کچھ فارسی اشعار کی مثالیں دیکر کہتے ہیں کہ:

> واضح ہو کہ ایسے بہت سے کلام دکھلائے جا سکتے ہیں کہ جن میں مخاطب کے مذکر ہونے کی تخصیص نہیں ثابت ہوتی ہے۔ نئی روشنی والے ایسے اشعار کے مخاطب کو اپنی تقلید پرستی کے مذاق کے مطابق مؤنث ہی قیاس فرمائیں گو یہ اشعار ایسے ہیں کہ عورت اپنے اس معشوق کے حق میں جو فطرت کے مطابق سوا مذکر

کے مؤنث نہیں ہوسکتا، زورِشوق میں پڑھ سکتی ہے۔لیکن کچھ اشعار ایسے بھی پائے جاتے ہیں کہ ان کا مخاطب ایسا ہی ہے کہ سوا مذکر کے مؤنث نہیں ہوسکتا تو اس کی صورت یا یہ ہے کہ وہاں مخاطب معشوق حقیقی ہے جو کسی زبان میں مؤنث قرار نہیں دیا جاسکتا[۱۴] جیسا کہ اشعار ذیل سے معلوم ہوگا۔

حسن خود درردئے خوباں آشکارا کردہٖ
پس بچشم عاشقاں خود راتماشا کردۂ
پر توِ حسنت نگنجد در زمین و آسمان
در حریم سینہ حیرانم کی چوں جا کردہٖ

لمؤلفہ

اے روئے ابد رنگ گرفتہ زبہارت
در گلشن حسن تو گزر نیست خزاں را

یا یہ کہ وہاں مخاطب ایک ایسا مرد جوان رعنا ہے کہ جس کی شان میں عورت کی طرف سے شاعر کلامِ عاشقانہ قلم بند کرتا ہے۔

حسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگ زمین بود گرفتار شدم

زنہار اس شعر سے غرض شاعر اظہار امرد پرستی نہیں ہے جیسا کہ کج فہم معترضوں نے سمجھا ہے۔اب رہی اردو کی عاشقانہ سخن سنجی تو اس کی حالت یہ ہے کہ زبان اردو میں ہر لفظ مذکر ہے۔یا مؤنث خود لفظ معشوق مذکر ہے اور جتنے الفاظ معشوق کے معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں مذکر ہیں۔جیسے یار، جاناں، بت، صنم وغیرہ وغیرہ۔پس ضرورتِ زبان کی وجہ سے جب کوئی کلام عاشقانہ رنگ میں قلم بند ہوتا ہے تو اس کا مخاطب بھی ضرور مذکر قرار پاتا ہے۔ورنہ درحقیقت مراد شاعر کبھی امرد پرستی نہیں ہوتی۔[۱۵]

اس طرز سخن کا دوسرا سبب امداد امام اثر فارسی و اردو صنفِ غزل کے مخصوص مزاج سے متعین کرتے ہیں:

غزل گوئی ایک ایسی صنفِ سخن شاعری ہے کہ جو فارسی اور اردو کے سوا کسی زبان میں اس وضع خاص سے نہیں دیکھی جاتی ہے۔اور اگر اس کے تقاضوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس سے تمجید باری تعالیٰ و انکشاف حقائقِ عشق وغیرہ مراد ہے۔لیکن عوام یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں عاشقانہ مضامین قلم بند ہوتے ہیں

اور اکثر مرکوزِ شاعر کوئی معشوق مجازی ہوتا ہے۔حالانکہ یہ بات نہیں ہے اس صنف شاعری کو زیادہ تعلق معشوق حقیقی سے ہے۔بالغرض اگر کہیں پر معشوق مجازی بھی مرکوز شاعر ہوتا ہے تو اس خوبی کے ساتھ ذکر کر پاتا ہے کہ شان کلام میں کسی طرح پر ابتذال نہیں لاحق ہوتا ہے۔پس جب غزل گوئی سے مرادِ شاعر یہ ہے کہ عاشقانہ پیرایہ سخن میں تمجید باری تعالیٰ کی شکل پیدا ہو یا دیگر معاملات عشقیہ و امور ذہنیہ احاطۂ تحریر میں در آئیں تو عظمتِ مضامین کے خیال سے شاعر اپنے مخاطب کلام کو پیرایہ مذکر میں دکھلاتا ہے۔اگر معشوق کو بہ ترکیب مؤنث خطاب کرتا تو احاطۂ خیال تنگ ہو جانے کے باعث وہ وسعت کلام جس کی بدولت ذہن سامع فوراً معشوق حقیقی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے بالکل رخصت ہو جاتی۔اس وقت تو یہ وسعت حاصل ہے کہ جب کسی شعر میں شاعر معشوق کا ذکر کرتا ہے یا معشوق کی طرف خطاب کرتا ہے تو معشوق حقیقی کا تصور بے اختیار دل میں آ جاتا ہے۔ایسی حالت میں یہ قصدِ اصلاح نئی روشنی والوں کی جانب سے کہ اب سے جتنے اشعار کہے جائیں ان میں جہاں ذکر معشوق کا کیا جائے تو نحوی ترکیب صیغہ و ضمائر کی مؤنث ہوا کرے خالی از نقصان نہیں ہے۔واقعی یہ عجیب پوچ فرمائش ان حضرات کی ہے اس سے تو بالکل غرضِ غزل گوئی فوت ہو جاتی ہے۔علاوہ توجیہ بالا کے یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اہل اسلام میں عورتیں پردہ نشیں مانی جاتی ہیں۔اس لیے انہیں مستورات کہتے ہیں رواج مذہبی وملکی یہی ہے اور اس قدر رسم پردہ داخل معاشرت ہو گیا ہے کہ سوسائٹی میں بے دھڑک ایک غزل میں بیس جگہ مستورات کا ذکر بہ سبیل وضمیر مؤنث نہایت مکروہ معلوم ہو گا۔جب تک اس رسم پر پردہ کو حضرات نئی روشنی والے متروک نہ فرمالیں اس ترکیب کے ساتھ اصلاح غزل گوئی میں کوشاں نہ ہو۔[۱۶] ۔۔۔بلا شبہ غزل گوئی میں معشوق کو بار بار بصیغہ وضمیر مؤنث ذکر کرنا عظمت غزل گوئی کو ضائع کرنے ولا ہو گا۔[۱۷]

صنف غزل کے اس مخصوص اور تخلیقی ارادے سے متعینہ طریق کار کے علاوہ مثنوی اور مرثیوں وغیرہ کے بارے میں انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ یہاں اردو میں بھی صیغہ تانیثیت ہی کا استعمال کیا جاتا ہے:

مثنوی ڈراما، مراثی وغیرہ میں جو طور دنیا میں صیغہ وضمیر کے استعمال کا ہے اس کی پابندی شعرائے اُردو کو بھی کرنی پڑے گی اور اس وقت بھی کرتے ہیں۔میر حسن نے اپنی مثنوی سحر البیان میں بدر منیر کو مذکر نہیں لکھا ہے اور نہ کوئی مثنوی گو اس طریقۂ بیان سے انحراف کرے گا۔ظاہراً نئی روشنی والوں کو تبعیت نیچر

کی پابندی کا بڑا خیال معلوم ہوتا ہے۔تبعیت فطرت اللہ ایک ایسی شئے ہے کہ اس کا التزام انسان کے لیے واجبات سے ہے مگر بدلحاظی کے ساتھ کسی امر کا پابند ہونا قباحت سے خالی نہیں ہوتا۔اہل انصاف غور فرمائیں کہ اردو کی ترکیب کی ایک خاص وضع کی ہے ہر لفظ کے مذکر یا مؤنث ہونے سے یہ زبان نہ صرف دشوار ہو رہی ہے بلکہ اس کا انداز بھی نرالا ہو رہا ہے۔یہ اعتراض کہ معشوق کو فطرت اللہ کی رو سے مؤنث ہونا چاہیے عجب اعتراض ہے۔فطرت کی رو سے تو معشوق مذکر و مؤنث دونوں ہوسکتا ہے۔مرد کا معشوق جب کوئی ہوگا تو عورت ہوگی۔عورت کا معشوق جب کوئی ہوگا تو مرد ہوگا۔اگر فطرت کی رو سے ہمیشہ معشوق کو مؤنث ہونا چاہیے تو کوئی عورت شاعرہ اور بھی عاشق (کذا، شاعرہ اور عاشق بھی؟) ہو تو اس کے معشوق کو بھی مونث ہونا چاہیے واقعی نئی روشنی والوں کی پابندی فطرت کا یہ عجیب نتیجہ نکلے گا خدا جانے اُن حضرات نے کیوں مذکر و مؤنث کا یہ بکھیڑا پھیلایا ہے۔ہر قدم پر یورپ کی تقلید کرنا چہ معنی دارد۔تبعیت فطرت کا معنی تقلید یورپ نہیں ہے۔[۱۸]

ان اقتباسات سے متبادر ہونے والے اصول کو اگر ہم ایک نظریے کی شکل دیں تو صورت کچھ یوں بنے گی: غزل جو کہ ہند و مسلم تہذیب کی ایک اہم فنی صنف ہے اپنی نہاد میں وضاحت کے بجائے ایمائیت و اشارت کا مزاج رکھتی ہے اس لیے لسانیاتی اعتبار سے فارسی کے برعکس اردو میں افعال وضمائر اور اشارات کے صیغے الگ ہونے یعنی مونث و مذکر کی تفریق کے باوجود غزل کا فنی و تہذیبی پیرائیہ اس طریق کار کو ترجیح دینے کا ہے جو اس کی ایمائیت و وسعت کے حسب حال ہو۔صیغہ مذکر کا استعمال چونکہ معشوقانِ مجازی اور محبوبِ حقیقی دونوں کو محیط ہوتا ہے اس لیے ایمائیت کا معاون ہے۔اس کے برعکس صیغۂ مونث ایک متعین جنس کی طرف مشار ہونے کی بنا پر غزل کے ایمائی پہلو کو مجروح کرنے کا سبب بنتا ہے۔مگر اس مسئلے کی تہذیبی معنویت یہ ہے کہ فارسی سے لسانی اختلاف کے باوجود یہ مسلم تہذیب کا نظام اقدار ہے جو اپنی ثقافت کے پیدا کردہ فنی اوضاع (بالخصوص غزل) تک میں سرایت کر کے تجلیل، تمجید اور حفظ عزت وحرمت کے بارے میں اپنے تصورات کی پاسداری کراتا ہے۔اس طرح پیرائیہ کلام و اظہار میں جو وسعت اور رفعت پیدا ہوتی ہے، وہ ایک طرف ابتذال و سوقیت سے محفوظ رکھتی ہے اور دوسری طرف ایک ہی کلام کے اندر انتقالِ ذہنی کو ماورا کی طرف لے جانے اور ارضی معروض کی طرف پلٹانے کی گنجائش بھی دیتی ہے۔اس طرح ایک ہی پیرائے میں جمع یہ دو امکانات سراسر لطف و انبساط کا ذریعہ بنتے ہیں۔

یہ تو ہوا مسلم تہذیب اور اس کی ایک اہم صنفِ غزل کے حوالے سے صیغہ تذکیر برائے معشوق کے استعمال کا

مسئلہ۔ اسی طرح امداد اثر نے ہندی گیت اور دوہے میں عورت کے خطاب بہ مرد اور ہندی عاشقانہ کلام کے سوز و درد کی بھی جو توجیہہ کی ہے وہ بھی بہت منفرد اور ہندو کلچر و مذہب کے مزاج کے مطابق ہے:

> ہندی گیتوں وغیرہ میں بھی معشوق اکثر مذکر دیکھا جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ معشوق وہاں ترکیب زبان کی رو سے مذکر واقع ہے۔ بلکہ ہندی کی شاعریاں جو عاشقانہ رنگ میں ہوتی ہیں عورت کی طرف سے مرد کی طرف ہوتی ہیں۔ یہ ایک عجیب امر ہے کہ ہندوستان کی عورتوں کی افتادِ مزاج سے خبر دیتا ہے۔ ہندوستان کی عورتیں اپنے مردوں کو اس قدر چاہتی ہین کہ روئے زمین پر ان کا سا عشق کہیں نہیں دیکھا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہیں ایک شوہر کے بعد دوسرے شوہر کے پانے کی کسی حالت میں توقع نہیں رہتی ہے۔ اس لیے ہندی کا عاشقانہ کلام ایسا پُر از سوز ہوتا ہے کہ کسی ملک کی عاشقانہ شاعری اس کو نہیں پہنچتی ہے۔ یہ گیت ہندی ایسے پر تاثیر ہوتے ہیں کہ ان کو سن کر دل ہاتھ سے جانے لگتا ہے۔ اکثر گیتوں میں عورت اپنے شوہر سے بچھڑ جانے کے مضمون کو بیان کرتی ہے یا اشتیاقیہ کلام از قسم انتظار و یاس وغیرہ کو زبان پر لاتی ہے۔ علاوہ اس کے قومی معشوق ہندوؤں کے شام یعنی کاندھ جی ہیں۔ اکثر گیت جو تصنیف ہوتے ہیں ان کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ پس ایسی حالتوں میں ہندی گیتوں اور دہروں وغیرہ میں معشوق مخاطب مذکر ہوا کرتا ہے۔[۱۹]

ہندو معاشرت میں ستی کی رسم کی وجہ سے چونکہ عورت کے لیے ایک شوہر کے بعد دوسرے شوہر کو پانے کا کوئی امکان نہیں ہوتا ہے، اس لیے برہ کے گیتوں کا درد و یاس دوسری زبانوں کی شاعری میں پائے جانے والے فراقیہ کلام کی نسبت کہیں زیادہ پُر اثر ہوتا ہے۔

غزل کے صیغہ مذکر پر اعتراضات کی تاریخ نئی نہیں ہے۔لیکن کاشف الحقائق میں اس مسئلے کو جو توجیہہ و تحلیل کی گئی ہے وہ اتنی عمدہ اور جامع ہے کہ اس کی پوری وضاحت کے لیے یہ طول طویل اقتباسات دینا ضروری تھے۔ان اقتباسات کی روشنی میں ہم نے یہ بھی واضح کیا کہ اردو کی اس اہم ترین صنف (غزل) میں اسلامی تہذیب کا نظام اقدار کس شدت سے اپنا اظہار کر رہا ہے کہ آج فیمنزم کے دور میں بھی اردو کے اکثر نئے شعرا اپنے اشعار میں صیغہ مذکر کے استعمال کو ترجیح دے رہے ہیں۔ ذرا سوچیے جس تہذیب کا ادبی نظام اقدار آج اپنے دور زوال میں بھی اتنا طاقت ور ہے وہ اپنے عروج میں کن کمالات کا مرقع ہوگا۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ کاشف الحقائق کی اثر پذیری کے باب میں آزاد، حالی اور شبلی کے حوالے سے راقم نے یہاں جو کچھ لکھا ہے اس کے حوالہ جات کے لیے دیکھئے راقم کی کتاب اردو تنقید چند منزلیں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء

۲۔ امداد امام اثر، سید، کاشف الحقائق، مرتبہ: وہاب اشرفی، قومی کونسل فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۴۶۴-۴۶۵

۳۔ شمیم احمد، ۲+۲=۵، قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۱۹۷۷ء، ص ۴۳

۴۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، عبدالماجد دریا آبادی، احوال و آثار، لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۵۱

۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''امداد امام اثر''، مشمولہ: استعارہ، مدیران ڈاکٹر امجد طفیل، ریاظ احمد، رانا چیمبرز، چوک پرانی انارکلی، لیک روڈ لاہور، اپریل ۲۰۱۸ء تا جون ۲۰۱۸ء، ص ۱۸۸

۶۔

http://lib.bazmeurdu.net/%DA%A9%D8%A7
%D8%B4%D9%81-%D8%A7%D9%84%D8%
AD%D9%82%D8%A7%D8%A6%D9%82-%DA%A9%DB%8C-%
D8%AA%D8%A7%D8%B1%DB%8C%D8%AE%
DB%8C-%D9%88-%D8%AA%D9%86%D9%82%DB%8C%D8%AF%DB%8C/

۷۔ اثر کا ایک اہم تنقیدی کارنامہ شاعری کو 'داخلی' اور 'خارجی' میں تقسیم کرنا سمجھا جاتا ہے اور چونکہ انہوں نے مغرب کے چند بڑے بڑے شاعروں کے ساتھ میر انیس کو بھی اس فہرست میں شامل کیا ہے جن کے ہاں دونوں طرح کی شاعری کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ اس لیے شمس الرحمٰن فاروقی کے نزدیک ''میر انیس کی غیر معمولی اور مطلق عظمت کو تسلیم کرنے کی سمت میں یہ پہلا قدم'' ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی، ''امداد امام اثر''، مشمولہ: استعارہ، مدیران ڈاکٹر امجد طفیل، ریاظ احمد، رانا چیمبرز، چوک پرانی انارکلی، لیک روڈ لاہور، اپریل ۲۰۱۸ء تا جون ۲۰۱۸ء، ص ۱۸۲-۱۸۳

۸۔ آزاد، محمد حسین، آب حیات، تاج بک ڈپو، لاہور، س ن، ص ۸-۷

آزاد، محمد حسین، نیرنگِ خیال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۶ء

۹۔ امداد امام اثر، سید، کاشف الحقائق، مرتبہ: وہاب اشرفی، قومی کونسل فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۹۲-۹۳

۱۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''امداد امام اثر''، مشمولہ: استعارہ، مدیران ڈاکٹر امجد طفیل، ریاظ احمد، رانا چیمبرز، چوک پرانی انارکلی، لیک روڈ لاہور، اپریل ۲۰۱۸ء تا جون ۲۰۱۸ء، ص ۱۷۹-۱۸۰

۱۱ حالی، الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ: وحید قریشی، مکتبہ جدید لاہور، ۔۔۔ص ۲۱۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۱۳

۱۳۔ کاشف الحقائق، مرتبہ: وہاب اشرفی، ص ۲۶۲-۲۶۳

۱۴۔ اثر بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ آنے والے دنوں میں فیمینزم کی تحریک کے تحت خدا کے لیے صیغہ مذکر کے استعمال کو بھی پدرسری سماج کی تشکیل قرار دیکر رد کیا جائے گا

۱۵۔ کاشف الحقائق، مرتبہ: وہاب اشرفی، ص ۲۶۳-۲۶۴

۱۶۔ اثر نے یہ بات آج سے سوسوا سو سال پہلے لکھ تو دی تھی مگر ہم جانتے ہیں کہ آج ۲۰۱۸ء تک بھی اردو کے بے شمار غزل گو ایسے ہیں جن کے اشعار میں، باوجودیکہ اب صیغہ تانیثیت کا استعمال بھی عام ہو چکا ہے، اب بھی محبوب بصیغہ مذکر ہی آتا ہے

۱۷۔ کاشف الحقائق، مرتبہ: وہاب اشرفی، ص ۲۶۴-۲۶۵

۱۸۔ کاشف الحقائق، مرتبہ: وہاب اشرفی، ص ۲۶۵-۲۶۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۶۶-۲۶۷